اور برے کیا اثرات ہیں جو آج ہماری قومی زندگی میں پائے جاتے ہیں۔

میں ان تینوں سوالات پر وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالوں گا تاکہ ہماری موجودہ خرابیوں میں سے ہر خرابی کا پورا شجرۂ نسب آپ کے سامنے آجائے اور آپ دیکھ لیں کہ ہر خرابی کی اصل کیا ہے اور اس کی جڑیں کہاں تک پھیلی ہوئی ہیں اور کن اسباب سے اپنی غذا حاصل کر رہی ہیں۔ اس کے بعد ہی آپ اس پوری اسکیم کو سمجھ سکیں گے جو علاج و اصلاح کے لیے ہمارے پیش نظر ہے۔

ہماری غلامی کے اسباب

پچھلی صدی میں جو غلامی ہم پر مسلط ہوئی تھی وہ درحقیقت ہمارے صدیوں کے مسلسل مذہبی، اخلاقی، ذہنی انحطاط کا نتیجہ تھی۔ مختلف حیثیتوں سے ہم روز بروز پستی کی طرف چلے جا رہے تھے، یہاں تک کہ گرتے گرتے ہم اس مقام پر پہنچ گئے تھے جہاں اپنے بل بوتے پر کھڑا رہنا ہمارے لیے ممکن نہ تھا۔ اس حالت میں کسی نہ کسی بلا کو ہم پر مسلط ہونا ہی تھا، اور ٹھیک قانون قدرت کے مطابق وہ بلا ہم پر مسلط ہوئی۔

دینی حالت اس کی تحقیق کے لیے ہمیں سب سے پہلے اپنی اس وقت کی دینی حالت کا جائزہ لینا چاہیے کیونکہ ہمارے لیے سب سے زیادہ اہمیت اپنے دین ہی کی ہے۔ وہی ہماری زندگی کا قوام ہے۔ اسی نے ہم کو ایک قوم اور ایک ملت بنایا ہے۔ اسی کے بل پر ہم دنیا میں کھڑے ہو سکتے ہیں اور کھڑے رہ سکتے ہیں۔

ہماری پچھلی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ اس ملک میں اسلام کسی منظم کوشش کے نتیجے میں نہیں پھیلا ہے۔ سندھ کی ابتدائی اسلامی فتح اور اس کے بعد کی ایک صدی کو مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے۔ اس کو چھوڑ کر بعد کے کسی دور میں کوئی ایسی منظم طاقت نہیں رہی جو یہاں ایک طرف اسلام کو پھیلاتی اور جہاں جہاں وہ پھیلتا جاتا وہاں اس کو جمانے اور مضبوط و مستحکم کرنے کی کوشش بھی ساتھ ساتھ کرتی جاتی۔ بالکل ایک غیر منظم طریقے سے کہیں کوئی صاحب علم آگیا جس کے اثر سے کچھ لوگ مسلمان ہو گئے، کہیں کوئی تاجر پہنچ گیا جس کے ساتھ ربط ضبط رکھنے کی وجہ سے کچھ لوگوں نے کلمہ

پڑھ لیا، اور کہیں کوئی نیک نفس اور خدا رسیدہ بزرگ تشریف لے آئے جن کے بلند اخلاق اور پاکیزہ زندگی کو دیکھ کر بہت سے لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ مگر نہ تو ان متفرق افراد کے پاس ایسے ذرائع تھے کہ جن جن لوگوں کو وہ مسلمان کرتے جاتے ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام بھی ساتھ ساتھ کرتے چلے جاتے۔ اور نہ وقت کی حکومتوں ہی کو اس کی کچھ فکر تھی کہ وہ دوسرے اللہ کے بندوں کی کوششوں سے جہاں جہاں اسلام پھیل رہا تھا وہاں وہ لوگوں کی اسلامی تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام کر دیتیں۔

اس غفلت کی وجہ سے ہمارے عوام ابتدا سے جہالت اور جاہلیت میں مبتلا رہے ہیں تعلیمی اداروں سے اگر فائدہ اٹھایا ہے تو زیادہ تر متوسط طبقوں نے اٹھایا ہے یا پھر اونچے طبقوں نے۔ عوام الناس اسلام کی تعلیمات سے بے خبر اور اس کے اصلاحی اثرات سے بڑی حد تک محروم ہی رہے۔ اسی کا نتیجہ ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ قبیلے کے قبیلے غیر مسلم قوموں سے نکل کر اسلام میں آئے مگر آج تک ان میں جاہلیت کی وہ بہت سی رسمیں موجود ہیں جو اسلام قبول کرنے سے پہلے ان میں پائی جاتی تھیں یہی نہیں بلکہ ان کے خیالات تک پوری طرح نہ بدل سکے۔ ان کے اندر آج بھی وہ بہت سے مشرکانہ عقائد اور مشرکانہ اوہام موجود ہیں جو اپنے غیر مسلم آباؤ اجداد کے مذہب سے انہیں وراثت میں ملے تھے۔ بڑے سے بڑا فرق جو مسلمان ہونے کے بعد ان کے اندر واقع ہوا وہ بس یہ تھا کہ انہوں نے اپنے پچھلے معبودوں کی جگہ کچھ نئے معبود خود اسلام کی تاریخ میں سے ڈھونڈ نکالے اور پرانے مشرکانہ اعمال کے نام بدل کر اسلامی اصطلاحات میں سے کچھ نئے نام اختیار کر لیے۔ عمل جوں کا توں رہا، صرف اس کا ظاہری روپ بدل گیا۔

اس کا ثبوت اگر آپ چاہیں تو کسی علاقے میں جا کر عوام کی مذہبی حالت کا جائزہ لیجیے اور پھر تاریخ میں تلاش کیجیے کہ اسلام کے آنے سے پہلے اس علاقے میں کونسا مذہب رائج تھا۔ آپ دیکھیں گے کہ آج بھی وہاں اُس سابق مذہب سے ملتے جُلتے عقائد و اعمال ایک دوسری شکل میں رائج ہیں مثلاً جہاں پہلے بدھ مذہب پایا جاتا تھا وہاں کسی زمانے میں بدھ کے آثار پوجے جاتے تھے ــــ کہیں اس کا کوئی

دانت رکھا ہوا تھا، کہیں اس کی کوئی ہڈی محفوظ تھی، کہیں اس کے دوسرے تبرکات کو مرکز توجہات بنا کر رکھا گیا تھا — آج آپ دیکھیں گے کہ اس علاقے میں وہی معاملہ آج نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک، یا آپ کے نقش قدم، یا دوسرے بزرگان دین کے آثار متبرکہ کے ساتھ ہو رہا ہے۔ اسی طرح آپ پرانے پرانے مسلم قبیلوں کے موجودہ رسم و رواج کا جائزہ لیں اور پھر تحقیق کریں کہ انہی قبیلوں کی غیر مسلم شاخوں میں کیا رسمیں رائج ہیں۔ دونوں میں آپ بہت کم فرق پائیں گے۔ یہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ پچھلی صدیوں میں جو لوگ مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کے سربراہ کار رہے ہیں انہوں نے بالعموم اپنا فرض انجام دینے میں سخت کوتاہی کی ہے۔ انہوں نے اسلام پھیلانے والے بزرگوں کے ساتھ کوئی تعاون نہیں کیا۔ کروڑوں آدمی اسلام کی کشش سے کھچ کھچ کر اس کے دائرے میں آئے، مگر جو اسلام کے گھر کے منتظم اور متولی تھے انہوں نے ان بندگان خدا کی تعلیم، تربیت، ذہنی اصلاح، اور زندگی کے تزکیے کا کوئی انتظام نہ کیا۔ اس وجہ سے یہ قوم مسلمان ہو جانے کے باوجود اسلام کی برکات اور توحید کی نعمتوں سے پوری طرح بہرہ مند نہ ہو سکی، اور ان نقصانات سے نہ بچ سکی جو شرک و جاہلیت کا لازمی نتیجہ ہیں۔

پھر دیکھیے کہ ان پچھلی صدیوں میں ہمارے علماء کا کیا حال رہا ہے۔ چند مقدس بزرگوں نے تو فی الواقع اس دین کی غیر معمولی خدمات انجام دیں جن کے اثرات پہلے بھی نافع ہوئے اور آج تک نفع بخش ثابت ہو رہے ہیں، مگر عام طور پر علماء دین جن مشاغل میں مشغول رہے وہ یہ تھے کہ چھوٹے چھوٹے مسائل پر مناظرہ بازیاں کیں۔ چھوٹے مسائل کو بڑے مسائل بنایا اور بڑے مسائل کو مسلمانوں کی نظروں سے اوجھل کر دیا۔ اختلافات کو مستقل فرقوں کی بنیاد بنایا اور فرقہ بندی کو جھگڑوں اور لڑائیوں کا اکھاڑہ بنا کر رکھ دیا۔ معقولات کے پڑھنے پڑھانے میں عمریں گزار دیں اور قرآن و حدیث سے نہ خود ذوق رکھا نہ لوگوں میں پیدا کیا۔ فقہ میں اگر کوئی دلچسپی لی تو موشگافیوں اور جزئیات کی بحثوں کی حد تک لی۔ تفقہ فی الدین پیدا کرنے کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ ان کے اثرات جہاں جہاں بھی پہنچے لوگوں کی نگاہیں خوردبین بن کر رہ گئیں، وہ دین وجہاں دید نہ بھی

سکیں۔ آج یہ پوری میراث جھگڑوں اور مناظروں اور فرقہ بندیوں اور روز افزوں فتنوں کی لہلہاتی ہوئی فصل کے ساتھ ہمارے حصے میں آئی ہے۔

صوفیا کا حال دیکھیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ چند پاکیزہ ہستیوں کے سوا، جنہوں نے اسلام کے حقیقی تصوف پر خود عمل کیا اور دوسروں کو اس کی تعلیم دی، باقی سب ایک ایسے تصوف کے معلم و مبلغ تھے جس میں اشراقی اور ویدانتی اور مانوی اور زرتشتی فلسفوں کی آمیزش ہو چکی تھی اور جس کے طریقوں میں جوگیوں اور راہبوں اور اشراقیوں اور رواقیوں کے طریقے اس طرح مل جل گئے تھے کہ اسلام کے خالص عقائد و اعمال سے ان کو مشکل ہی سے کوئی مناسبت رہ گئی تھی۔ خلق خدا ان کی طرف خدا کا راستہ پانے کے لیے رجوع کرتی تھی اور وہ ان کو دوسرے رستے بتاتے تھے۔ پھر جب اگلوں کے بعد پچھلے ان کے سجادوں پر بیٹھے تو انہوں نے میراث میں دوسری املاک کے ساتھ اپنے بزرگوں کے مرید بھی پائے اور ان سے تربیت و ارشاد کے بجائے صرف نذرانوں کا تعلق باقی رکھا۔ ان حلقوں کی تمام تر کوشش پہلے بھی یہ رہی ہے اور آج بھی ہے کہ جہاں جہاں بھی ان کی پیری و پیرزادگی کا اثر پھیلا ہوا ہے وہاں دین کا صحیح علم کسی طرح نہ پہنچنے پائے، کیونکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ عوام الناس پر ان کی خداوندی کا طلسم اسی وقت تک قائم رہ سکتا ہے جب تک وہ اپنے دین سے جاہل رہیں۔

اخلاقی حالت یہ تھی ہماری مذہبی حالت جس نے انیسویں صدی میں ہم کو غلامی کی منزل تک پہنچانے میں بہت بڑا حصہ لیا تھا اور آج اس آزادی کی صبح آغاز میں بھی یہی حالت اپنی پوری قباحتوں کے ساتھ ہماری دامن گیر ہے۔

اب اخلاقی حیثیت سے دیکھیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ عام طور پر اس زمانے میں ہمارا طبقہ متوسط جو ہر قوم کی ریڑھ کی ہڈی ہوتا ہے، مسلسل اخلاقی انحطاط کی بدولت بالکل بجاڑے کا ٹٹو (Mercenary) بن کر رہ گیا تھا۔ اس کا اصول یہ تھا کہ جو بھی آجائے اُجرت پر اس کی خدمات حاصل کر لے اور پھر جس مقصد کے لیے چاہے اس سے کام لے لے۔ ہزاروں لاکھوں

آدمی ہمارے ہاں کرائے کے سپاہی بننے کے لیے تیار تھے جنہیں ہر ایک نوکر رکھ کر جس کے خلاف چاہتا لڑوا سکتا تھا، اور ہزاروں لاکھوں ایسے لوگ بھی موجود تھے جن کے ہاتھ اور دماغ کی طاقتوں کو کم یا زیادہ اجرت پر ہے کر ہر فاتح اپنا نظم و نسق چلوا سکتا تھا، بلکہ اپنی سیاسی چال بازیوں تک میں استعمال کر سکتا تھا۔ ہماری اس اخلاقی کمزوری سے ہمارے ہر دشمن نے فائدہ اٹھایا ہے، خواہ وہ مرہٹے ہوں، سکھ ہوں، فرانسیسی ہوں یا ولندیزی۔ اور آخر کار انگریز نے آکر خود ہمارے ہی سپاہیوں کی تلوار سے ہم کو فتح کیا اور ہمارے ہی ہاتھوں اور دماغوں کی مدد سے ہم پر حکومت کی۔ ہماری اخلاقی حس اس درجہ کُند ہو چکی تھی کہ اس روش کی قباحت سمجھنا تو درکنار، ہمیں اُلٹا اس پر فخر تھا۔ چنانچہ ہمارا شاعر اسے اپنے خاندانی مفاخر میں شمار کرتا ہے کہ

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری

حالانکہ کسی شخص کا پیشہ ور سپاہی ہونا حقیقت میں اس کے اور اس سے تعلق رکھنے والوں کے لیے باعثِ ننگ ہے نہ کہ باعثِ عزت۔ وہ آدمی ہی کیا ہُوا جو نہ حق اور باطل کی تمیز رکھتا ہو نہ اپنے اور پرائے کا امتیاز۔ جو بھی اسے پیٹ کو روٹی اور تن کو کپڑا دے وہ اس کے لیے شکار مارنے پر آمادہ ہو جائے اور کچھ نہ دیکھے کہ میں کس کے لیے کس پر جھپٹ رہا ہوں۔ یہ اخلاقی حالت جن لوگوں کی تھی ان میں کسی دیانت و امانت اور کسی مستقل وفاداری اور مخلصانہ وفاداری کا پایا جانا مستبعد تھا اور ہونا چاہیے تھا۔ جب وہ اپنی قوم کے دشمنوں کے ہاتھ خود اپنے آپ کو بیچ سکتے تھے، تو ان کے اندر کسی پاکیزہ اور طاقت ور ضمیر کے موجود ہونے کی آخر وجہ ہی کیا ہو سکتی تھی؟ کیوں وہ رشوت اور غبن کا نام "دستِ غیب" اور "خدا کا فضل" نہ رکھتے؟ کیوں وہ ابن الوقت اور چڑھتے سورج کے پرستار نہ ہوتے؟ اور کیوں ان میں یہ وصف پیدا نہ ہوتا کہ جس کے ہاتھ سے انہیں تنخواہ ملتی ہو اس کے لیے اپنے ایمان و ضمیر کے خلاف سب کچھ کرنے پر آمادہ ہو جائیں؟ ـــــ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہمارے ملازمت پیشہ طبقے کی اکثریت آج جن اوصاف کا اظہار کر رہی ہے وہ کوئی اتفاقی کمزوری نہیں ہے جو

اچانک ان میں پیدا ہو گئی ہو بلکہ اس کی جڑیں ہماری روایات میں گہری جمی ہوئی ہیں۔ البتہ افسوس اگر ہے تو اس بات کا ہے کہ کل ان سے ہمارے دشمن ناجائز فائدہ اٹھا رہے تھے، اور آج ان کو ہماری قوم کے وہ رہنما استعمال کر رہے ہیں جنہیں درحقیقت قوم کے امراض کا معالج ہونا چاہیے تھا نہ کہ ان امراض سے فائدہ اٹھانے والا!

ہمارے طبقۂ متوسط کی ان کمزوریوں میں ہمارے علماء بھی شریک تھے۔ اگرچہ ایک قلیل تعداد جس طرح طبقۂ متوسط میں بلند اخلاق اور مضبوط سیرت لوگوں کی موجود تھی، اسی طرح علماء میں بھی کچھ ایسی مقدس شخصیتیں موجود رہیں جنہوں نے اپنے فرض کو ٹھیک پہچانا اور اپنی جانیں لڑا کر اسے ادا کیا اور دنیا کی کوئی دولت ان کو نہ خرید سکی۔ مگر عام طور پر جو اخلاقی حالت طبقۂ متوسط کی تھی وہی علماء کی بھی تھی۔ ان میں بیشتر وظیفہ خوار تھے۔ کسی نہ کسی بادشاہ یا امیر یا دربار سے وابستہ ہو جانا، اس کے وظیفے کھا کر اس کے منشا کے مطابق دین اور دینی قوانین کی تعبیریں کرنا، اپنے ذاتی مفاد کو دین کے تقاضوں پر مقدم رکھنا، اور اپنے مخدوموں کی خاطر علماء حق کو دبانے کے لیے مذہب کے ہتھیار استعمال کرنا ان کا شعار رہا۔ یہ مچھر کو چھانتے اور اونٹ نگلتے رہے ہیں۔ بے اثر اور بے دولت لوگوں کے معاملہ میں تو ان کی نکتہ چینی اتنی تیز رہی ہے کہ مستحبات اور مکروہات اور چھوٹے سے چھوٹے جزئیات تک میں یہ ان کو معاف کرنے پر کبھی تیار نہ ہوتے اور ان امور کی خاطر انہوں نے بڑے بڑے جھگڑے برپا کر دیے مگر اہل دولت اور اربابِ اقتدار کے معاملہ میں، خواہ وہ مسلم ہوں یا کافر، یہ ہمہ تن مصالحت بنے رہے اور جزئیات چھوڑ کر کلیات تک میں انہوں نے ان کے لیے رخصتیں نکالیں۔

رہے ہمارے اُمراء، تو ان کے لیے دنیا میں صرف دو ہی چیزیں دلچسپی کا مرکز رہ گئی تھیں۔ ایک پیٹ۔ دوسرے شرمگاہ۔ ان کے سوا کسی دوسری چیز کی ان کی نگاہ میں کوئی اہمیت نہ رہی تھی۔ ساری کوششیں اور ساری محنتیں بس انہی کی خدمت کے لیے وقف تھیں، اور قوم کی دولت سے انہی پیشوں اور صنعتوں اور حرفتوں کو پروان چڑھایا جا رہا تھا جو ان دو چیزوں کی خدمت کریں

اس سے ہٹ کر اگر کسی امیر نے اپنی دولت و طاقت کو کسی بڑے مقصد کے لیے استعمال کیا تو سارے امیروں نے مل کر اسے گرانے کی کوشش کی اور اپنی قوم کے دشمنوں سے اس کے خلاف سازباز کرنے میں بھی تامل نہ کیا۔

ذہنی حالت | اس کے بعد جب ذہنی حیثیت سے ہم اپنی تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کئی صدیوں سے ہمارے ہاں علمی تحقیقات کا کام قریب قریب بند تھا۔ ہمارا سارا پڑھنا پڑھانا بس علومِ اوائل تک محدود تھا۔ ہمارے نظامِ تعلیم میں یہ تصور گہری جڑوں کے ساتھ جم گیا تھا کہ اسلاف جو کام کر گئے ہیں وہ علم و تحقیق کا حرفِ آخر ہے، اس پر کوئی اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ بڑی سے بڑی علمی خدمت بس یہی ہو سکتی تھی کہ اگلوں کی لکھی ہوئی کتابوں پر شرحوں اور حاشیوں کے ردّے پڑھائے جائیں۔ انہی چیزوں کے لکھنے میں ہمارے مصنفین، اور ان کے پڑھنے پڑھانے میں ہمارے مدرسین مشغول رہے۔ کسی نئی فکر، کسی نئی تحقیقات، کسی نئی دریافت کا شکل ہی سے قریب کی ان صدیوں میں ہمارے ہاں کہیں پتہ چلتا ہے۔ اس کی وجہ سے ایک مکمل جمود کی سی کیفیت ہماری ذہنی فضا پر طاری ہو چکی تھی۔

ظاہر ہے کہ جو قوم اس حالت میں مبتلا ہو چکی ہو وہ زیادہ دیر تک آزاد نہیں رہ سکتی تھی۔ اس کو لامحالہ کسی نہ کسی ایسی قوم سے مغلوب ہو ہی جانا تھا جو حرکت کرنے والی اور آگے بڑھنے والی ہو، جس نے اپنے عام لوگوں میں بیداری پیدا کر لی ہو، جس کے افراد میں اپنے فرائض کا ــــ جو کچھ بھی وہ اپنے فرائض سمجھتے ہوں ــــ احساس پایا جاتا ہو، جس کے کارکنوں اور کارفرماؤں میں کوئی مستقل اور مخلصانہ وفاداری موجود ہو، جس کے اہلِ علم تحقیقات کرنے والے اور نئی طاقتیں دریافت کرنے والے ہوں، جس کے اہلِ تدبیر ان نئی دریافت شدہ طاقتوں کو زندگی کے کاموں میں استعمال کرنے والے ہوں، اور جس کا قدم تمدن و تہذیب کے مختلف شعبوں میں ترقی کی طرف مسلسل بڑھا چلا جا رہا ہو۔ ایسی کسی قوم کی موجودگی میں ایک جامد اور ایک ضعیف الاخلاق اور ایک جاہلیت زدہ قوم آخر کتنی دیر زمین پر قابض رہ سکتی تھی؟ پس یہ کوئی اتفاقی

حادثہ نہ تھا بلکہ قانونِ فطرت کا تقاضا تھا کہ ہم مغرب کی ترقی یافتہ قوموں میں سے ایک کے غلام ہو کر رہے۔

مغربی تہذیب کی بنیادیں

اب ہمیں دیکھنا چاہیے کہ وہ قوم جو مغرب سے آکر ہم پر مسلط ہوئی، جس کی طاقت سے ہم مغلوب ہوئے، اور جس کی غلامی کا جوا ہماری گردن پر رکھا گیا، وہ اپنے ساتھ کیا کچھ لائی تھی؟ اس کے نظریات کیا تھے؟ اس کا مذہب اور اس کا فلسفہ کیا تھا؟ اس کے اخلاقی اصول کیا تھے؟ اس کے تمدنی و تہذیبی رنگ ڈھنگ کیا تھے؟ اس کی سیاست کن بنیادوں پر مبنی تھی؟ اور اس کی ان سب چیزوں نے ہمیں کس کس طرح کتنا کتنا متاثر کیا؟

مذہب جن صدیوں میں ہم مسلسل انحطاط کی طرف جا رہے تھے، ٹھیک وہی صدیاں تھیں جن میں یورپ نشأۃ جدیدہ کی ایک نئی تحریک کے سہارے اُبھر رہا تھا۔ اس تحریک کا آغاز ہی میں دورِ متوسط کے عیسائی مذہب سے تصادم ہو گیا اور یہ تصادم ایک ایسے افسوسناک نتیجے پر ختم ہوا جو نہ صرف یورپ کے لیے بلکہ ساری دنیا کے لیے غارت گر ثابت ہوا۔ پرانے زمانے کے عیسائی متکلمین نے اپنے مذہبی عقائد کی اور بائیبل کے تصورِ کائنات و انسان کی پوری عمارت یونانی فلسفہ و سائنس کے نظریات، دلائل اور معلومات پر تعمیر کر رکھی تھی اور اُن کا گمان یہ تھا کہ ان بنیادوں میں سے کسی کو اگر ذرا سی ٹھیس بھی لگ گئی تو یہ پوری عمارت دھڑام سے زمین پر آ رہے گی اور اس کے ساتھ مذہب بھی ختم ہو جائیگا۔ اس لیے وہ نہ کسی ایسی تنقید و تحقیق کو گوارا کرنے کے لیے تیار تھے جو یونانی فلسفہ و سائنس کے مسلمات کو مشتبہ بناتی ہو، نہ کسی ایسے فلسفیانہ تفکر کو برداشت کر سکتے تھے جو ان مسلّمات سے ہٹ کر کوئی دوسری ایسی فکر پیش کرتی ہو جس کی وجہ سے اہلِ کلیسا کو اپنے علمِ کلام پر نظرِ ثانی کرنی پڑ جائے اور نہ کسی ایسی علمی تحقیقات کی اجازت دے سکتے تھے جس سے کائنات و انسان کے بارے میں بائیبل کی دی ہوئی اور متکلمین کی مانی ہوئی تصویر کا کوئی جز غلط ثابت ہو جائے۔ اس طرح کی ہر چیز کو وہ مذہب کے لیے، اور مذہب پر بنے ہوئے پورے نظامِ تمدن و سیاست و معیشت کے لیے

براہِ راست خطرہ سمجھتے تھے۔ اس کے برعکس جو لوگ نشأۃ جدیدہ کی تحریک اور اس کے محرکات کے زیرِ اثر تنقید، تحقیق اور دریافت کا کام کر رہے تھے انہیں قدم قدم پر اس فلسفہ و سائنس کی کمزوریاں معلوم ہو رہی تھیں جن کے سہارے عقائد و کلام کا یہ پورا نظام کھڑا ہوا تھا۔ مگر وہ جوں جوں اس میدان میں آگے بڑھتے تھے، اہلِ کلیسا اپنے مذہبی اور سیاسی اقتدار کے بل بوتے پر زیادہ سے زیادہ سختی کے ساتھ ان کی راہ روکنے کی کوشش کرتے تھے۔ آنکھوں کو پچھلے زمانے کی مانی ہوئی حقیقتوں کے خلاف بہت سی چیزیں روزِ روشن میں نظر آ رہی تھیں۔ مگر اہلِ کلیسا کو اصرار تھا کہ ان مسلّمات پر نظرِ ثانی کرنے کے بجائے دیکھنے والی آنکھیں پھوڑ دی جائیں۔ دماغوں کو بہت سے ان نظریات میں جھول محسوس ہو رہا تھا جن کو پہلے بعض عقائد کی اٹل دلیل سمجھا گیا تھا۔ مگر اہلِ کلیسا کہتے تھے کہ ان دلائل پر غور مکرر کرنے کے بجائے ان دماغوں کو پاش پاش کر دینا چاہیے جو ایسی باتیں سوچتے ہیں۔

اس کشمکش کا پہلا نتیجہ یہ ہوا کہ جدید علمی بیداری میں اوّل روز ہی سے مذہب اور اہلِ مذہب کے خلاف ایک ضد سی پیدا ہو گئی اور جوں جوں اہلِ مذہب کی سختیاں بڑھتی گئیں، یہ ضد بھی بڑھتی اور پھیلتی چلی گئی۔ یہ ضد صرف مسیحیت اور اس کے کلیسا ہی تک محدود نہ رہی بلکہ مذہب فی نفسہٖ اس کا ہدف بن گیا۔ علومِ جدیدہ اور تہذیبِ جدید کے علمبرداروں نے یہ سمجھ لیا کہ مذہب بجائے خود ایک ڈھونگ ہے۔ وہ کسی عقلی امتحان کی ضرب نہیں سہہ سکتا۔ اس کے عقائد دلیل پر نہیں بلکہ اندھے اذعان پر مبنی ہیں۔ علم کی روشنی بڑھنے سے وہ ڈرتا ہے کہ کہیں اس کا پول کھل جائے۔

پھر جب علم کے میدان سے آگے بڑھ کر سیاست اور معیشت اور نظامِ اجتماعی کے مختلف میدانوں میں یہ کشمکش چلی اور اہلِ کلیسا کی حتمی شکست کے بعد تہذیبِ جدید کے علمبرداروں کی قیادت میں ایک نئے نظامِ زندگی کی عمارت اٹھی، تو اس سے دو اور نتیجے برآمد ہوئے جنہوں نے نئے دور کی پوری انسانی تاریخ پر گہرا اثر ڈالا:

ایک یہ کہ نئے نظامِ زندگی کے ہر شعبے سے "مذہب" کو جلاوطن کر دیا گیا، اور اس کا

دائرہ صرف شخصی عقیدہ وعمل تک محدود کر کے رکھ دیا گیا۔ یہ بات تہذیبِ جدید کے بنیادی اصولوں میں داخل ہوگئی کہ مذہب کو سیاست، معیشت، اخلاق، قانون، علم وفن، غرض اجتماعی زندگی کے کسی شعبے میں بھی دخل دینے کا حق نہیں ہے۔ وہ محض افراد کا ایک شخصی معاملہ ہے۔ کوئی شخص اپنی انفرادی زندگی میں خدا اور پیغمبروں کو ماننا چاہے تو مانے، اور ان کی دی ہوئی ہدایات کی پیروی کرنا چاہے تو کرتا رہے۔ مگر اجتماعی زندگی کی ساری اسکیم اس سوال سے قطع نظر کر کے بننی اور چلنی چاہیے کہ مذہب اس کے بارے میں کیا ہدایت دیتا ہے اور کیا ہدایت نہیں دیتا۔

دوسرے یہ کہ تہذیب جدید کی رگ رگ میں خدا بیزاری اور لامذہبیت کی ذہنیت پیوست ہوگئی۔ علوم وفنون اور ادب کا جو کچھ بھی ارتقاء ہوا اس کی جڑیں وہ ضد برابر موجود رہی جو علمی بیداری کے آغاز میں مذہب اور اس سے تعلق رکھنے والی ہر چیز کے خلاف پیدا ہو چکی تھی۔ اس فکری غذا سے پرورش پائی ہوئی تہذیب جہاں جہاں بھی پہنچی وہاں اندازِ فکر یہ ہو گیا کہ مذہب جو چیز بھی پیش کرتا ہے، خواہ وہ خدا اور آخرت اور وحی اور رسالت کا عقیدہ ہو یا کوئی اخلاقی وتمدنی اصول، بہرحال وہ شک کا مستحق ہے، اس کی صحت کا کوئی ثبوت ملنا چاہیے، اور نہ ملے تو اس سے انکار کیا جانا چاہیے۔ اس کے برعکس ہر وہ چیز جو دنیوی علوم وفنون کے اساتذہ کی طرف سے آئے وہ مان لینے کی مستحق ہے، الّا یہ کہ اس کے غلط ہونے کا کوئی ثبوت مل جائے۔ یہ اندازِ خیال مغرب کے پورے نظامِ فکر پر اثر انداز ہوا ہے اور اس نے صرف علم وادب ہی کو مذہبی نقطۂ نظر سے منحرف نہیں کر دیا ہے بلکہ تمام وہ اجتماعی فلسفے اور اجتماعی نظام، جو اس نظامِ فکر کی بنیاد پر بنے ہیں، عملاً خدا پرستی کے تخیل سے خالی اور آخرت کے تصور سے عاری ہیں۔

فلسفۂ حیات یہ تو تھا مذہب کے بارے میں اس آنے والی فاتح تہذیب کا رویّہ۔ اب دیکھیے کہ اس کا اپنا فلسفۂ حیات کیا تھا جسے مذہب کی نفی کر کے اس نے اختیار کیا تھا۔

یہ سراسر ایک مادہ پرستانہ فلسفہ تھا۔ مغرب کے فکری رہنما محسوسات سے ماوراء کسی غیبی حقیقت کو ماننے کے لیے نہ تو تیار ہی تھے اور نہ وحی والہام کے سوا ـــ جس کے وہ منکر تھے ـــ حقائقِ غیب

کو جاننے اور ٹھیک سمجھنے کا اور کوئی ذریعہ ہی ہو سکتا تھا۔ پھر سائنٹفک اسپرٹ اس امر میں بھی مانع تھی کہ وہ مجرد قیاسات پر غیبی حقیقتوں کے متعلق کسی تصور کی عمارت کھڑی کر دیں۔ اس کی کوشش اگر کی بھی گئی تو علمی تنقید کے مقابلے میں وہ نہ ٹھیر سکی۔ اس لیے غیب کے بارے میں جب وہ شک اور لا ادریت کے مقام سے آگے نہ بڑھ سکے تو ان کے لیے اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ دنیا اور اس کی زندگی کے متعلق وہ جو رائے بھی قائم کریں صرف حواس کے اعتماد پر کریں۔ اس چیز نے ان کے پورے فلسفۂ زندگی کو ظاہر پرستی بنا کر رکھ دیا۔ انہوں نے سمجھا کہ انسان ایک قسم کا حیوان ہے جو اس زمین پر پایا جاتا ہے۔ وہ نہ کسی کا تابع ہے نہ کسی کے آگے جواب دہ۔ اس کو کہیں اوپر سے ہدایت بھی نہیں ملتی۔ اپنی ہدایت اسے خود لینی ہے اور اس ہدایت کا ماخذ اگر کوئی ہے تو قوانینِ طبیعی ہیں، یا حیوانی زندگی کی معلومات، یا پھر خود پچھلی انسانی تاریخ کے تجربات۔ انہوں نے سمجھا کہ زندگی جو کچھ ہے بس یہی دنیا کی زندگی ہے۔ اسی کی کامیابی اور خوشحالی عین مطلوب ہے۔ اور اسی کے اچھے اور برے نتائج مدارِ فیصلہ ہیں۔ انہوں نے سمجھا کہ انسان کی زندگی کا کوئی مقصد اپنی طبیعت کے تقاضوں کو پورا کرنے اور اپنے نفس کی خواہشوں کو حاصل کرنے کے سوا نہیں ہے۔ انہوں نے سمجھا کہ حقیقت جو کچھ بھی ہے انہی چیزوں کی ہے جن کو ناپا یا تولا جا سکے، یا جن کا وزن و قدر کسی طرح کی پیمائش قبول کر سکے۔ جو چیزیں اس نوعیت کی نہیں ہیں وہ بے حقیقت اور بے قدر ہیں، ان کے پیچھے پڑنا وقت ضائع کرنا ہے۔

میں یہاں اُن فلسفیانہ نظاموں کا ذکر نہیں کر رہا ہوں جو مغرب میں بنے، کتابوں میں لکھے گئے، اور یونیورسٹیوں میں پڑھے پڑھائے جاتے رہے ہیں۔ اُس تصورِ کائنات و انسان اور اُس تصورِ حیات دنیا کا ذکر کر رہا ہوں جسے مغربی تہذیب و تمدن نے اپنے اندر جذب کیا اور جو ایک عام مغربی کے ذہن میں، اور اس سے اثر لینے والے ایک عام انسان کے ذہن میں پیوست ہوا۔ اس کا خلاصہ یہی کچھ ہے جو میں نے آپ کے سامنے بیان کیا ہے۔

اس کے علاوہ تین بڑے غلط طریقے ایسے ہیں جو اٹھارویں اور انیسویں صدی میں ——

اُسی زمانے میں جبکہ ہم مغرب کے غلام ہو رہے تھے ---- اٹھے اور اپنی تفصیلات سے قطع نظر، اپنی روح کے اعتبار سے پوری تہذیب پر چھا گئے۔ میں یہاں خاص طور پر ان کا ذکر کروں گا، کیونکہ انسانی زندگی پر جتنا ہمہ گیر اثر ان کا پڑا ہے، شاید کسی اور چیز کا نہیں پڑا۔

ہیگل کا فلسفۂ تاریخ

ان میں سے پہلا نظریہ وہ ہے جو ہیگل نے تاریخ انسانی کی تعبیر کے سلسلے میں پیش کیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ تاریخ کے ایک دور میں انسانی تہذیب و تمدن کا جو نظام بھی ہوتا ہے وہ اپنے تمام شعبوں اور اپنی تمام شکلوں سمیت دراصل چند مخصوص تخیلات پر مبنی ہوتا ہے جو اسے ایک دورِ تہذیب بناتے ہیں۔ یہ دورِ تہذیب جب پختہ ہو چکتا ہے تو اس کی کمزوریاں واضح ہونی شروع ہوتی ہیں اور اس کے مقابلے میں کچھ دوسرے تخیلات اُبھرنے شروع ہوتے ہیں جو اس سے جنگ شروع کر دیتے ہیں۔ اس نزاع و کشمکش سے ایک نیا دورِ تہذیب جنم پاتا ہے جس میں پچھلے دورِ تہذیب کے باقیاتِ صالحات بھی رہ جاتے ہیں اور کچھ نئی خوبیاں بھی اُن تخیلات کے اثر سے پیدا ہو جاتی ہیں جن کی یلغار سے مجبور ہو کر پچھلے دور کے غالب تخیلات بالآخر مصالحت پر مجبور ہوئے تھے۔ پھر یہ دورِ تہذیب بھی پختگی کو پہنچ کر اپنے ہی بطن سے اپنے چند مخالف تخیلات کو جنم دیتا ہے، اور پھر نزاع و کشمکش برپا ہوتی ہے اور پھر دونوں کی مصالحت سے ایک تیسرا دور وجود میں آتا ہے جو پچھلے دور کی خوبیاں اپنے اندر باقی رکھتا ہے اور ان کے ساتھ نئے تخیلات کی لائی ہوئی خوبیاں بھی جذب کر لیتا ہے۔

اس طرح ہیگل نے انسانی تہذیب کے ارتقاء کی جو تشریح کی اس سے عام طور پر ذہنوں نے یہ اثر قبول کیا کہ پچھلا ہر دورِ تہذیب اپنے اپنے وقت پر اپنی خامیوں اور کمزوریوں کی وجہ سے ختم ہوا ہے، اور اپنی خوبیاں بعد کے دورِ تہذیب میں چھوڑ گیا ہے۔ بالفاظ دیگر اب جس دورِ تہذیب سے ہم گزر رہے ہیں وہ گویا خلاصہ ہے اُن تمام اجزائے صالحہ کا جو پہلے گزرے ہوئے ادوارِ تہذیب میں پائے جاتے تھے۔ آگے اگر کسی ترقی کا امکان ہے تو اُن نئے تخیلات میں ہے جو اس دورِ تہذیب کے بنیادی تخیلات سے جنگ کرنے کے لیے اٹھیں پچھلے ادوار میں

کوئی چیز ایسی موجود نہیں ہے جس سے ہدایت و رہنمائی حاصل کرنے کے لیے اب پیچھے پلٹ کر دیکھنے کی ضرورت ہو۔ کیونکہ ان کے جو اجزاء بعد کے ادوارِ تہذیب میں جذب نہیں ہوئے، اُن کو آزما کر اور ناقص پا کر انسانی تاریخ پہلے ہی ٹھکرا چکی ہے۔ ہمارا تاریخی ذوق ان کی کسی چیز کی اگر کوئی قدر کر سکتا ہے تو اس حیثیت سے کر سکتا ہے کہ وہ اپنے وقت میں ایک قابلِ قدر چیز رہ چکی ہے اور انسانی تہذیب کے ارتقاء میں اپنے حصے کا کام انجام دے چکی ہے۔ مگر وہ آج اس دور کے لیے نہ قابلِ قدر ہے نہ کسی طرح مطمحِ نظر بننے کی مستحق۔ اس لیے کہ تاریخ اس کے بارے میں پہلے ہی اپنا فیصلہ دے چکی۔

آپ ذرا غور کریں کہ درحقیقت یہ کیسا خطرناک فلسفہ ہے۔ تہذیبِ انسانی کی تاریخ کا یہ تصور جس شخص کے ذہن میں اتر جائے، کیا آپ توقع کر سکتے ہیں کہ اس کے دل میں پھر اُن ادوارِ تہذیب کی کچھ بھی قدر و قیمت باقی رہ سکتی ہے جن میں ابراہیم اور موسیٰ اور محمد صلی اللہ علیہم اجمعین گزرے ہیں؟ کیا وہ کبھی دورِ نبوت اور خلافتِ راشدہ کی طرف بھی ہدایت و رہنمائی کے لیے رجوع کر سکتا ہے؟ دراصل یہ ایک ایسا مدلّل اور منظم فکری حملہ ہے جس کی ضرب اگر کسی ذہن پر کاری لگ جائے تو اس میں سے دینی تخیل کی جڑ ہی کٹ کر رہ جاتی ہے۔[1]

ڈارون کا نظریۂ ارتقاء | دوسرا فلسفہ جو انیسویں صدی میں اُبھرا اور انسانی ذہنوں پر چھایا وہ ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کا پیدا کردہ تھا۔ مجھے یہاں اُس کے حیاتیاتی (Biological) پہلو سے بحث نہیں ہے۔ میں اُس کے صرف اُن فلسفیانہ اثرات سے بحث کر رہا ہوں جو ڈارون کے طرزِ استدلال اور اُس کے اخذ کردہ نتائج سے نکل کر وسیع تر اجتماعی فکر میں جذب ہوئے۔ عام انسانی ذہن نے ڈارون کے بیان سے متاثر ہو کر کائنات کا جو تصور قائم کیا وہ یہ تھا کہ یہ کائنات ایک رزم گاہ ہے جہاں ہر آن ہر طرف زندگی و بقا کے لیے ایک ابدی جنگ برپا ہے۔ تنازع

[1] یہاں اس فلسفۂ تاریخ پر تنقید کرنے کا کوئی موقع نہیں ہے۔ اس کی غلطیاں اگر کوئی صاحب سمجھنا چاہیں تو وہ ہماری کتاب تنقیحات حصہ دوم (صفحہ ۲۲۵-۲۳۲) اور تفہیم القرآن (سورۂ مائدہ، حاشیہ ۲۷) ملاحظہ فرمائیں۔

ہے ہی کچھ ایسا کہ جسے زندہ اور باقی رہنا ہو اُسے نزاع اور کشمکش اور مزاحمت کرنی پڑتی ہے، اور مزاجِ فطرت واقع ہی کچھ اس طرح ہوا ہے کہ اس کی نگاہ میں وہی بقا کا مستحق ہے جو ثبوتِ بقا کا ثبوت دے دے۔ اس بے رحم نظام میں جو فنا ہوتا ہے وہ اس لیے فنا ہوتا ہے کہ وہ کمزور ہے، اور اسے فنا ہونا ہی چاہیے۔ اور جو باقی رہتا ہے وہ اس لیے باقی رہتا ہے کہ وہ طاقت ور ہے اور اسے باقی ہی رہنا چاہیے۔ زمین اور اس کا ماحول اور اس کے وسائلِ زندگی غرض یہاں جو کچھ بھی ہے طاقت ور کا حق ہے جس نے زندہ رہنے کی قابلیت کا ثبوت دے دیا ہو۔ کمزور کا ان چیزوں پر کوئی حق نہیں ہے۔ اسے طاقت ور کے لیے جگہ خالی کرنی چاہیے اور طاقت ور سراسر برسرِ حق ہے اگر وہ اسے ہٹا کر یا مٹا کر اس کی جگہ لیتا ہے۔

غور کیجیے، یہ تصورِ کائنات جب دماغوں میں بیٹھ جائے اور نظامِ فطرت کو اس نگاہ سے دیکھا جانے لگے تو انسان انسان کے لیے کیا کچھ بن کر رہے گا؟ اس فلسفۂ زندگی میں ہمدردی، محبت، رحم، ایثار اور اس طرح کے دوسرے شریفانہ انسانی جذبات کے لیے کیا جگہ ہو سکتی ہے؟ اس میں عدل و انصاف، امانت و دیانت، اور صداقت و راستبازی کا کیا کام؟ اس میں حق کا وہ مفہوم کہاں باقی رہتا ہے جو کبھی کمزور کو بھی پہنچ سکتا ہو، اور ظلم کے وہ معنی کب ہو سکتے ہیں جن سے کبھی طاقت ور بھی گناہ گار ٹھیرایا جا سکتا ہو؟ لڑنے جھگڑنے کا کام اگرچہ پہلے بھی انسان کرتا رہا ہے، مگر پہلے اسے فساد سمجھا جاتا تھا اور اب وہ عین تقاضائے فطرت ہے۔ کیونکہ کائنات تو ہے ہی ایک میدانِ جنگ۔ ظلم پہلے بھی دنیا میں ہوتا تھا، مگر پہلے وہ ظلم تھا اور اب اسے ایک ایسی منطق مل گئی جس سے وہ طاقت ور کا حق بن گیا۔ اس فلسفے کے بعد یورپ والوں کو اُن تمام مظالم کے لیے جو انہوں نے دوسری قوموں پر ڈھائے، ایک محکم دلیل ہاتھ آگئی۔ انہوں نے اگر امریکہ اور آسٹریلیا اور افریقہ کی پرانی نسلوں کو مٹایا اور کمزور قوموں کو اپنا غلام بنایا تو یہ گویا ان کا حق تھا جو انہوں نے عین قانونِ فطرت کے مطابق حاصل کیا۔ مٹنے والے مٹنے ہی کے مستحق تھے اور ان کی جگہ لینے والوں کا حق ہی تھا کہ وہ ان کی جگہ لیں۔ اس

بارے میں اگر اہلِ مغرب کے ضمیر میں پہلے کوئی خلش تھی بھی تو ڈارون کی منطق نے اسے دلائل و شواہد سے دور کر دیا۔ سائنس میں اس نظریے کی حیثیت جیسی کچھ بھی ہو[1]، معاشرت اور تمدن اور سیاست میں آکر تو اس نے انسان کو انسان کے لیے بھیڑیا بنا کر رکھ دیا۔

مارکس کی مادی تعبیرِ تاریخ اُسی کا ہم جنس ایک اور فلسفہ تھا جو ڈارون ہی کے زمانے میں مارکس کی مادی تعبیرِ تاریخ کے بطن سے نکلا۔ اس کی تفصیلات اور اس کے دلائل سے میں یہاں کوئی بحث نہ کروں گا اور نہ اس کی علمی حیثیت پر کوئی تنقید ہی کروں گا[2]۔ میں یہاں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ انسانی ذہن کو اس نے بھی حیات و دنیا کا وہی تصور دیا جو پہلے ہیگل نے اور پھر ڈارون نے دیا تھا۔ ہیگل نے فکر کی دنیا کو رزم گاہ بنا کر پیش کیا تھا۔ ڈارون نے کائنات اور نظامِ فطرت کو میدانِ جنگ بنا کر دکھایا۔ اور مارکس نے وہی تصویر خود انسانی معاشرے کی بنا کر دکھا دی۔ اس تصویر میں انسان ہم کو شروع سے لڑتا جھگڑتا نظر آتا ہے۔ اس کی فطرت کا تقاضا یہی ہے کہ اپنی اغراض اور اپنے مفاد کے لیے اپنے ہم جنسوں سے لڑے۔ وہ سراسر خود غرضی کی بنا پر مختلف طبقوں میں تقسیم ہوا ہے۔ سراسر خود غرضی کی بنا پر ان طبقوں میں کشمکش اور نزاع برپا رہی ہے۔ اور انسانی تاریخ کا سارا ارتقاء اسی خود غرضانہ طبقاتی کشمکش کی بدولت ہوا ہے۔ قوموں اور قوموں کی لڑائی تو درکنار، خود ایک ہی قوم کے مختلف طبقوں کی لڑائی بھی اس تصویر میں ہم کو سراسر ایک تقاضائے فطرت نظر آتی ہے۔ اس میں ہم دیکھتے ہیں کہ انسان اور انسان کے درمیان اگر کوئی رشتہ ہے تو وہ صرف اغراض و مفاد کے اشتراک کا رشتہ ہے۔ ان رشتہ داروں سے ملنا اور متفق ہو کر اُن سب لوگوں سے لڑنا جن سے آدمی کی معاشی اغراض متصادم ہوں — خواہ وہ اپنے ہی ہم قوم اور ہم مذہب کیوں نہ ہوں — سراسر حق ہے، اور اس حرکت کا ارتکاب نہیں بلکہ اس سے اجتناب خلافِ فطرت ہے۔

---

[1] اس کی علمی حیثیت پر مختصر تنقید ہماری کتاب تفہیمات حصہ دوم میں ملے گی۔

[2] اس فلسفے پر بھی ایک مختصر تنقید تفہیمات حصہ دوم میں کی گئی ہے

اخلاق | یہ تھے وہ فلسفے اور وہ عقائد و افکار جو فاتح تہذیب کے ساتھ آئے اور ہم پر مسلط ہوئے۔

اب دیکھیے کہ اخلاق کے معاملے میں ان آنے والوں کے ساتھ کس قسم کے نظریات اور عملیات یہاں درآمد ہوئے۔ خدا اور آخرت کو نظر انداز کر دینے کے بعد ظاہر ہے کہ اخلاق کے لیے مادی قدروں کے سوا کوئی قدر، اور تجربی بنیادوں کے سوا کوئی بنیاد باقی نہیں رہتی۔ اس معاملے میں اگر کوئی شخص چاہے کہ وہ قدریں جو مذہب نے دی تھیں، مذہب کے سوا کسی دوسری بنیاد پر قائم رہیں۔ اور وہ اخلاقی اصول جو انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات سے انسان نے سیکھے تھے، ایمان کے سوا کسی اور چیز کے سہارے انسانی زندگی میں چلتے رہیں، تو یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ اسی لیے اہلِ مغرب میں سے جن لوگوں نے اس کی کوشش کی وہ ناکام ہوئے۔ بے دینی اور انکارِ آخرت کی فضا میں فی الواقع جس فلسفۂ اخلاق کو فروغ نصیب ہوا اور عملاً اہلِ مغرب کی زندگی میں جس نے رواج پایا وہ تھا خالص افادیت (Utilitarianism) کا فلسفہ جس کے ساتھ لذتیت (Epicureanism) کے ایک سادہ سے مادہ پرستانہ خلاصے کی آمیزش ہو گئی تھی۔ اسی پر مغرب کے پورے تمدن اور مغربی زندگی کے پورے طرزِ عمل کی بنا رکھی گئی۔ کتابوں میں افادیت اور لذتیت کی جو تشریحات لکھی گئی ہیں وہ چاہے جو کچھ بھی ہوں، مگر مغربی تہذیب اور سیرت و کردار میں اس کا جو جوہر جذب ہوا وہ یہ تھا کہ قابلِ قدر اگر کوئی چیز ہے تو صرف وہ جس کا کوئی فائدہ میری ذات کو پہنچتا ہو، یا "میری ذات" کے تصور میں کچھ وسعت پیدا ہو جائے تو، میری قوم کو پہنچتا ہو۔ اور فائدے سے مراد ہے دنیوی فائدہ — کوئی راحت، کوئی لذت، یا کوئی مادی منفعت۔ جس چیز سے اس طرح کا کوئی فائدہ میری طرف آئے یا میری قوم کی طرف آئے وہ نیکی ہے، قابلِ قدر ہے، مطلوب و مقصود ہے اور وہی اس لائق ہے کہ اس کے پیچھے ساری کوششیں صرف کی جائیں۔ اور جو ایسی نہیں ہے جس کا کوئی محسوس یا قابلِ پیمائش فائدہ اس دنیا میں مجھے یا میری قوم کو حاصل نہیں ہوتا وہ کسی توجہ کے لائق نہیں ہے۔ اور اس کے برعکس جو چیز دنیوی حیثیت سے نقصان دہ ہے، یا دنیوی فائدوں اور لذتوں سے محروم کرنے والی ہے، وہی بدی اور وہی گناہ ہے۔ اس سے اجتناب لازم ہے۔

اس اخلاق میں خیر و شر کا کوئی مستقل معیار نہیں ہے۔ کردار کے حسن و قبح کے لیے کوئی مستقل اصول نہیں ہے۔ ہر چیز اضافی اور عارضی ہے۔ ذاتی یا قومی منفعت کے لیے ہر اصول بنایا اور توڑا جا سکتا ہے۔ حصولِ مقصد کے لیے بدتر سے بدتر ذریعہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ فائدوں اور لذتوں کو ہر طریقے سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ آج جو کچھ خیر ہے وہ کل شر ہو سکتا ہے، اور آج جو خیر ہے وہ کل شر قرار پا سکتا ہے۔ ایک کے لیے حق و باطل کا معیار اور ہے اور دوسرے کے لیے اور۔ حلال اور حرام کی کوئی مستقل تمیز جس کا ہر حال میں لحاظ کیا جائے اور حق و باطل کا کوئی ابدی فرق جو کسی حال میں نہ بدلے، ایک دقیانوسی تصور ہے جسے ترقی کے قدم بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔

سیاست یہ تھے وہ اخلاقیات جو فاتحانہ رعب داب کے ساتھ آئے اور ہم پر حکمران ہوئے۔ اب اُس سیاسی نظام کو لیجیے جو یہاں قائم کیا گیا اور مغربی آقاؤں کی رہنمائی میں پروان چڑھا۔ اس کی بنیاد تین اصولوں پر قائم کی گئی تھی۔ ایک سیکولرزم یعنی لادینی۔ دوسرے نیشنلزم یعنی قوم پرستی۔ تیسرے ڈیموکریسی، یعنی حاکمیت جمہور۔

پہلے اصول کا مطلب یہ تھا کہ مذہب اور اس کے خدا اور اس کی تعلیمات کا کوئی تعلق سیاسی و اجتماعی معاملات سے نہیں ہے۔ اہلِ دنیا اپنی دنیا کے معاملات خود اپنی صوابدید کے مطابق چلانے کے مختار ہیں۔ جس طرح چاہیں چلائیں اور انہیں چلانے کے لیے جو اصول، قوانین، نظریے اور طریقے چاہیں بنائیں۔ خدا کو نہ ان معاملات میں بولنے کا کوئی حق، اور نہ ہمیں اس سے یہ پوچھنے کی ضرورت کہ وہ کیا پسند کرتا ہے اور کیا پسند نہیں کرتا۔ البتہ اگر کوئی بڑی مصیبت کبھی ہم پر ٹوٹ پڑے تو یہ بات سیکولرزم کے خلاف نہیں ہے کہ ایسے وقت میں خدا کو مدد کے لیے پکارا جائے، اور اس صورت میں خدا پر یہ فرض عائد ہو جاتا ہے کہ ہماری مدد کو آئے۔

دوسرے اصول کا مطلب یہ تھا کہ جس مقام سے خدا کو ہٹایا گیا ہے وہاں قوم کو لا بٹھایا جائے۔ قوم ہی معبود ہو۔ قوم ہی کا مفاد معیارِ خیر و شر ہو۔ قوم ہی کی ترقی اور اس کا وقار اور دوسروں پر اس کا غلبہ مطلوب و مقصود ہو۔ اور افراد کی ہر قربانی قوم کے لیے جائز بھی ہو اور واجب بھی۔ اس کے ساتھ "قومیت" کا جو

تصور ہمارے بیرونی آقاؤں نے یہاں درآمد کیا وہ غیر مذہبی، وطنی قومیت کا تصور تھا جس کے ساتھ مل کر قوم پرستی کا مسلک کم از کم ہمارے لیے تو کریلا اور نیم چڑھا ہو گیا کیونکہ جس ملک کی آبادی کا ۳/۴ حصہ غیر مسلم ہو اس میں "وطنی قومیت" کی بنیاد پر مذہب قوم پرستی کا رواج صریح طور پر یہ معنی رکھتا تھا کہ یا تو ہم سیدھی طرح ہی نہیں بلکہ پُرجوش طریقہ سے نامسلمان بنیں، یا پھر مذہب قوم پرستی کی رو سے کافرِ یعنی غدارِ وطن قرار پائیں۔

تیسرے اصول کا مطلب یہ تھا کہ قومی ریاست میں جس مقام سے مذہب کو بے دخل کیا گیا ہے وہاں جمہور قوم یعنی اکثریت کی رائے کو اس کا جانشین بنایا جائے۔ اکثریت، مذہب سے قطع نظر کرتے ہوئے، جسے حق کہے وہ حق اور جسے باطل کہے وہ باطل۔ اکثریت ہی کے بنائے ہوئے اصول اور قوانین اور ضوابط، قوم کا دین ہوں اور اکثریت ہی اس دین میں ہر رد و بدل کی مختار ہو۔

فاتح تہذیب کے اثرات

یہ سیاست تھی، یہ اخلاقیات تھے، یہ فلسفے تھے، اور مذہب کے بارے میں یہ خیالات تھے اُن لوگوں کے جو ہماری تاریخ کے ایک منحوس مرحلے میں باہر سے آکر ہم پر غالب ہوئے۔ ہم اس وقت جن کمزوریوں میں مبتلا تھے وہ آپ پہلے سن چکے ہیں۔ اور یہ لوگ جو تہذیب لائے تھے وہ یہ تھی جس کی تصویر ابھی آپ نے ملاحظہ فرمائی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تہذیب یہاں اس حیثیت سے نہیں آئی تھی کہ کچھ مسافر یا کچھ سیاح اسے لائے تھے۔ یہ اُن لوگوں کی تہذیب تھی جو یہاں حکمراں بن کر آئے تھے جن کو یہاں کی پوری زندگی پر وہ تسلط حاصل ہُوا تھا جو ان سے پہلے کبھی اس ملک کی کسی حکومت کو نصیب نہ ہُوا تھا جن کا وہ رعب — ذہنی اور مادی، دونوں طرح کا رعب — یہاں کی آبادی پر پڑا تھا جو شاید پہلے کسی حکمراں گروہ کا نہ پڑا تھا جن کے قبضے میں نشر و اشاعت اور تعلیم کے وسیع ذرائع بھی تھے، قانون اور عدالت کے کارگر ہتھیار بھی تھے، اور اس کے ساتھ معاش کے وسائل کو بھی ان کے اقتدار نے پوری طرح اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ اس لیے ان کی تہذیب نے ہم پر ایسا ہمہ گیر اثر ڈالا جس کی گیرائی سے ہماری زندگی کا کوئی شعبہ بچا

انہوں نے اپنی تعلیم ہم پر مسلط کی، اور اس طرح مسلط کی کہ رزق کی کنجیاں ہی لے کر اپنی تعلیم گاہوں

کے دروازوں پر لٹکا دیں جس کے معنی یہ تھے کہ اب یہاں رزق وہی پائے گا جو یہ تعلیم حاصل کریگا۔ اس دباؤ میں آکر ہماری ہر نسل کے بعد دوسری نسل پہلے سے بڑھ چڑھ کر ان تعلیم گاہوں کی طرف گئی اور وہاں وہ سارے ہی نظریات اور عملیات سیکھے جن کی روح اور شکل بالکل ہماری تہذیب کی ضد تھی۔ اگرچہ کھلا کافر تو وہ ہم میں سے ایک فی الاکھ کو بھی نہ بنا سکے، مگر فکر و نظر اور ذوق و وجدان اور سیرت و کردار میں ٹھیٹھ مسلمان انہوں نے شاید ۲ فی صدی کو بھی نہ رہنے دیا۔ یہ سب سے بڑا نقصان تھا جو انہوں نے ہم کو پہنچایا۔ کیونکہ اس نے ہمارے دلوں اور دماغوں میں ہماری تہذیب کی جڑوں ہی کو خشک کر دیا اور ایک دوسری مخالف تہذیب کی جڑیں ان میں پیوست کر دیں۔

انہوں نے اپنا معاشی نظام اپنے معاشی فلسفے اور نظریات سمیت ہم پر مسلط کیا، اور اس طرح مسلط کیا کہ رزق کے دروازے بس اسی شخص کے لیے کھل سکتے تھے جو اس معاشی نظام کے اصول اختیار کرے۔ اس چیز نے پہلے ہم کو حرام خور بنایا، پھر رفتہ رفتہ ہمارے ذہنوں سے حرام و حلال کی تمیز مٹائی، اور پھر نوبت یہاں تک پہنچا دی کہ ہم میں سے ایک کثیر تعداد کو اسلام کی ان تعلیمات ہی پر اعتقاد نہ رہا جن میں اس نے ان بہت سے طریقوں کو حرام قرار دیا تھا جنہیں مغرب کے قائم کیے ہوئے معاشی نظام نے حلال ٹھیرا رکھا ہے۔

انہوں نے اپنے قوانین ہم پر مسلط کیے اور ان سے صرف عملاً ہی ہمارے نظام تمدن و معاشرت کی شکل وصورت کو تبدیل نہ کیا، بلکہ ہمارے اجتماعی تصورات اور ہمارے قانونی نظریات کو بھی بہت کچھ بدل ڈالا۔ جو شخص قانون کے متعلق کچھ بھی واقفیت رکھتا ہے وہ اس بات کو جانتا ہے کہ اخلاق اور معاشرے سے اس کا نہایت گہرا تعلق ہے۔ انسان جب کبھی کوئی قانون بناتا ہے، اس کے پیچھے لازماً اخلاق اور معاشرت اور تمدن کا کوئی فلسفہ ہوتا ہے، اور اس کے پیش نظر کوئی خاص نقشہ ہوتا ہے جس پر وہ انسانی زندگی کو ڈھالنا چاہتا ہے۔ اسی طرح جب وہ کسی قانون کو منسوخ کرتا ہے تو گویا اس اخلاقی نظریے اور اس تمدنی فلسفے کو منسوخ کرتا ہے جس پر پچھلا قانون مبنی تھا، اور زندگی کے اس نقشے کو بدلتا ہے جو اس قانون سے بنا تھا۔ پس جب ہمارے انگریز حکمرانوں نے یہاں آکر ان تمام شرعی قوانین کو منسوخ

کیا جو اس ملک میں رائج تھے اور ان کی جگہ اپنے قوانین نافذ کیے، تو اس کے معنی صرف اسی قدر نہ تھے کہ ایک قانون کی جگہ دوسرا قانون جاری ہُوا، بلکہ اس کے معنی یہ تھے کہ ایک نظامِ اخلاق اور نظامِ تمدن پر خطِ نسخ پھیرا گیا اور اس کی جگہ دوسرے نظامِ اخلاق و تمدن کی داغ بیل ڈالی گئی۔ اس تغیر و تبدل کو مستحکم کرنے کے لیے انہوں نے یہاں کے لا کالجوں میں اپنی قانونی تعلیم رائج کی جس نے دماغوں میں یہ خیال بٹھایا کہ پچھلا قانون ایک دقیانوسی قانون تھا جو زمانۂ جدید کی ایک سوسائٹی کے لیے کسی طرح موزوں نہیں، اور یہ نیا طرزِ قانون سازی اپنے اصول و نظریات سمیت زیادہ صحیح اور زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ انہوں نے ہمارے اس بنیادی عقیدے تک کو متزلزل کر دیا کہ قانون سازی کے اختیارات اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہیں۔ اس کے بجائے انہوں نے یہ بات لوگوں کے ذہن نشین کی کہ اللہ کو اس معاملے سے کچھ سروکار نہیں، یہ لیجسلیچر کا کام ہے کہ جو کچھ چاہے فرض، واجب، یا حلال ٹھیرائے اور جو کچھ چاہے جُرم یا حرام قرار دے۔ پھر ان نئے قوانین نے جس طرح ہمارے اخلاق و تمدن پر اثر ڈالا اس کا اندازہ کرنے کے لیے صرف اتنی بات کافی ہے کہ یہی قوانین تھے جنہوں نے زنا اور قمار اور شراب اور بہت سی بیوعِ فاسدہ کو حلال کیا، جن کی حمایت و حفاظت میں طرح طرح کے فواحش اور معاصی نے یہاں رواج پایا، اور جن کی حمایت سے محروم ہو کر بہت سی وہ بھلائیاں بھی مٹتی چلی گئیں جو دورِ انحطاط تک میں ہمارے اندر بچی رہ گئی تھیں۔ مگر حالات نے ہماری دینی حِس کو ایسا کُند کر کے رکھ دیا کہ ہمارے بڑے بڑے صلحاء و اتقیاء تک کو اس قانونی نظام کے تحت کسی مسلمان کے وکیل اور جج بننے میں مضائقہ نظر نہ آیا، بلکہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ جنہوں نے اس کے مقابلہ میں اَلْحُکْمُ لِلّٰہِ کے اصول کو تازہ کرنا چاہا وہ ہمارے ہاں خارجی قرار پائے۔

انہوں نے اپنے اخلاقی مفاسد اور معاشرتی طور طریقے ہم پر مسلط کیے، اور اس طرح مسلط کیے کہ ان کے ہاں تقرب کا مقام اور تقدم کا شرف اُن لوگوں کے لیے مخصوص رہا جو اخلاق میں ان سے قریب تر اور معاشرت میں ان کے ہم رنگ ہوں۔ یہی چیز اثر و رسوخ اور معاشی خوشحالی اور مادی ترقی کی ضامن تھی۔ اس لیے رفتہ رفتہ ہمارے اونچے طبقے، اور ان کے پیچھے متوسط طبقے اس رنگ میں رنگتے چلے گئے،

اور آخر میں تصاویر، سینما، ریڈیو، اور سربرآوردہ لوگوں کی زندہ مثالوں نے یہ وبا عوام تک بھی پھیلانی شروع کر دی۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ایک صدی کے اندر ہم پھسلتے پھسلتے اس مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ ہمارے ہاں مخلوط تعلیم کا رواج گوارا کیا جا رہا ہے، اچھے اچھے گھرانوں کی خواتین رقص اور مے نوشی میں مبتلا ہو رہی ہیں، شریف زادیاں ایکٹرسیں بن کر وہ بے حیائی دکھا رہی ہیں جس کے لیے کبھی ہمارے ہاں کی طوائف بھی تیار نہ تھی، اور ہزاروں کے مجمعے اپنی بہنوں اور بیٹیوں کو پریڈیں کرتے دیکھتے ہیں اور ان کو دادِ تحسین دیتے ہیں۔ اب وہ منزل کچھ دور نہیں ہے جہاں پہنچ کر اہلِ مغرب کی طرح ہمارے ہاں بھی یہ سوال اٹھے گا کہ کنواری ماں اور حرامی بچے میں آخر عیب کیا ہے؟ کیوں نہ معاشرے میں انہیں بھی مادرِ منکوحہ اور بچۂ حلال کی طرح عزت کا مقام دیا جائے؟ مغرب بھی اس مقام پر ایک دن میں نہ پہنچا تھا۔ اُنہی منازل سے گزرتا ہوا پہنچا تھا جن سے ہم گزر رہے ہیں۔

پھر انہوں نے اپنے سیاسی نظریے اور سیاسی ادارے بھی ہم پر مسلط کیے جو ہمارے دین اور ہماری دنیا کے لیے کسی دوسری چیز سے کم غارت گر ثابت نہ ہوئے۔ اُن کے سیکولرزم نے ہمارے دینی تصورات کی جڑیں کھوکھلی کیں، اور ان کے نیشنلزم اور اُن کی ڈیموکریسی نے ہم کو مسلسل ایک صدی تک اتنا پیسا کہ آخر کار ہمیں اپنی آدھی قوم کو دے کر اور اپنی لاکھوں جانیں اور بے شمار عورتوں کی عصمتیں قربان کر کے صرف اپنی آدھی قوم کو اس چکّی کے پاٹوں سے بچا لینے پر آمادہ ہونا پڑا۔ اِن بے درد احمقوں نے ایک لمحہ کے لیے بھی یہ نہ سوچا کہ ہندوستان کے یہ ہندو اور مسلمان اور سکھ اور اچھوت مل کر جدید سیاسی معنوں میں ایک قوم کیسے قرار پا سکتے ہیں جس میں ڈیموکریسی کا یہ اصول چل سکے کہ قوم کی اکثریت قانون ساز اور حکمراں ہو اور اقلیت رائے عام کو ہموار کر کے اکثریت بننے کی کوشش کرتی رہے؟ انہوں نے کبھی یہ سمجھنے کی کوشش نہ کی کہ یہاں کی اقلیتیں اور اکثریتیں قومی اقلیتیں اور اکثریتیں ہیں نہ کہ محض سیاسی۔ انہوں نے، جن پر ۴۰ کروڑ انسانوں کے حال و مستقبل کی بھاری ذمہ داری تھی، اپنا ایک منٹ بھی اس معاملے کو سمجھنے پر صرف نہ کیا کہ ان مختلف قوموں کے مجموعے کو ایک قوم فرض کر کے یہاں سیکولر ڈیموکریسی قائم کرنے کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتے کہ ان میں سے ایک کثیر التعداد

قوم باقی سب قوموں کے مذہب، تہذیب اور قومی انفرادیت کو زبردستی مٹا کر رکھ دے۔ وہ اندھا دُھند اپنے گھر کے اصول اور نظریات اور عملی طریقے ایک بالکل مختلف ماحول پر ٹھونستے چلے گئے۔ ہندوستان کا چپہ چپہ برسوں منافرت کا زہر اور مظلوموں کا خون اور مسلسل کشمکش کا دھواں اُگل اُگل کر خبر دیتا رہا کہ یہ بالکل ایک غلط نظام ہے جو اس آبادی کے مزاج کے خلاف اس پر مسلط کیا جا رہا ہے۔ مگر انہوں نے اس کا نوٹس تک نہ لیا۔ ایک دیوار بیچ کے ہمسائے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ مگر انہوں نے اپنی پالیسی پر نظرِ ثانی کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ پھر جب نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ تقسیم کے سوا کوئی چارہ باقی نہ رہا تو وہ ایسے طریقے سے تقسیم کر کے رخصت ہوئے جس کی بدولت خون کے دریا اور لاشوں کے پہاڑ ہندوستان و پاکستان کی سرحد بنے، اور یہ تقسیم پچھلے جھگڑوں کے تصفیے کی ایک شکل بننے کے بجائے بہت سے نئے جھگڑوں کی بنیاد بن گئی جو نہ معلوم کتنی مدت تک اس برّعظیم کے لوگوں کو آپس کی دشمنی اور کشمکش میں مبتلا رکھیں گے۔

مَیں مانتا ہوں کہ ان بیرونی حاکموں نے یہاں کچھ اچھے کام بھی کیے۔ اُن کی بدولت جو مادّی ترقیات یہاں ہوئیں اور علومِ جدیدہ کے مفید پہلوؤں سے جو فائدہ ہمیں پہنچا، اُن کی قدر و قیمت سے مجھے انکار نہیں ہے۔ مگر کیا نسبت ہے اِن فائدوں کو اُن بے شمار اخلاقی، روحانی اور مادّی نقصانات سے جو ہمیں ان کی بالادستی سے پہنچ گئے؟

ہمارا ردِّ عمل

اِس کے بعد ہمیں جائزہ لے کر دیکھنا ہے کہ اِس غالب تہذیب کے ہجوم کا ردِّ عمل ہمارے ہاں کس کس شکل میں ہوا اور آج اس کے کیا اچھے اور بُرے اثرات ہم اپنی قومی زندگی میں پاتے ہیں۔ مجموعی طور پر یہاں اس کے مقابلے میں دو بالکل مختلف قسم کے ردِّ عمل ہوئے ہیں جن میں سے ہر ایک کے نہایت وسیع اور عمیق اثرات مترتب ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ میں پہلے ان دونوں کا الگ الگ حساب آپ کے سامنے پیش کروں گا، اور پھر ان کا حاصلِ جمع بھی آپ کے سامنے رکھ دوں گا۔

انفعالی ردِّ عمل ہم میں سے ایک گروہ کا ردِّ عمل یہ تھا کہ یہ طاقت ور اور ترقی یافتہ قوم جو ہم پر

حکمراں بن گرآئی ہے، اس سے وہ سب کچھ لے لو جو یہ دے رہی ہے اور اس کے وہ سارے اثرات قبول کرتے چلے جاؤ جو یہ ڈال رہی ہے۔ جو تعلیم یہ دیتی ہے اسے حاصل کرو۔ جو معاشی نظام یہ قائم کر رہی ہے اسے اپنا لو۔ جو قوانین یہ نافذ کر رہی ہے انہیں مان لو۔ جو معاشرت یہ لائی ہے اس کے رنگ میں رنگ جاؤ۔ اور جو سیاسی نظام یہ قائم کر رہی ہے اسے بھی تسلیم کر لو۔

اس ردِ عمل میں مرعوبیت اور شکست خوردگی کی روح تو ابتدا ہی سے تھی۔ تاہم اول اول اس کا محرک یہ خیال تھا کہ مغلوب و محکوم ہو جانے کے بعد اب مزاحمت ہمارے لیے ممکن نہیں ہے، مزاحمت کریں گے تو ہر حیثیت سے نقصان میں رہیں گے، لہٰذا ہمارے لیے اس کے سوا اب کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ زندگی اور ترقی کے جو مواقع اس نئے نظام میں حاصل ہو سکتے ہیں، ان سے فائدہ اٹھایا جائے۔ لیکن اس دلیل ــــ اور اپنی جگہ اچھی خاصی باوزن دلیل ــــ سے متاثر ہو کر ہمارے جو عناصر اس راہ پر گئے ان کی پہلی ہی نسل میں وہ نقصانات نمایاں ہونے شروع ہو گئے جو ایک مخالف تہذیب کے مقابلہ میں قبولیت و انفعال کا رویہ اختیار کرنے سے کسی قوم کو پہنچ سکتے ہیں۔ اور پھر ہر نسل کے بعد دوسری نسل ان نقصانات میں زیادہ سے زیادہ مبتلا ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ ایک قدرِ قلیل کے سوا ہمارا طبقۂ عالی اور طبقۂ متوسط اس وبا سے ماؤف ہو گیا اور اپنے بڑوں کی دیکھا دیکھی عوام تک اس کا زہر پھیلتا چلا گیا۔

مذہب کے متعلق اہلِ مغرب کا جو نقطۂ نظر تھا، ہمارے نئے تعلیم یافتہ لوگوں کی بڑی اکثریت نے اسے قریب قریب جوں کا توں قبول کیا اور یہ تک محسوس نہ کیا کہ مغرب نے مذہب کو جو کچھ سمجھا تھا وہ مسیحیت اور کلیسا کو دیکھ کر سمجھا تھا نہ کہ اسلام کو۔ وہ اس پورے اندازِ فکر کو اخذ کر بیٹھے جو اہلِ کلیسا کی ضد میں مذہب اور اس سے تعلق رکھنے والے مسائل و معاملات کے متعلق مغرب میں پیدا ہوا تھا۔ انہوں نے سمجھا کہ اسلام اور اس کی ہر چیز ہر شک کی مستحق ہے اور دلیل و ثبوت کی ضرورت اگر ہے تو اس کی کسی بات کے لیے ہے، نہ کہ ان نظریات کے لیے جو علم کے نام سے کوئی مغربی فلسفی یا سائنس داں یا ماہرِ علومِ عمران پیش کر دے۔ انہوں نے مغرب کے اس خیال کو بھی بلا تنقید مان لیا کہ مذہب فی الواقع ایک پرائیویٹ معاملہ ہے اور اجتماعی زندگی سے اس کو کچھ سروکار نہ ہونا چاہیے۔ یہ خیال ان کے ذہن میں کچھ اس طرح اتر گیا

کہ آج جو لوگ بے سوچے سمجھے اس چلتے ہوئے فقرے کو بار بار دہراتے ہیں کہ "اسلام ایک مکمل نظامِ زندگی ہے" وہ بھی ہر وقت اپنے ہر طرزِ عمل سے یہ ثابت کرتے رہتے ہیں کہ اسلام صرف ایک پرائیویٹ مذہب ہے جس سے پبلک معاملات میں کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ ان میں سے اکثر و بیشتر لوگوں کے لیے اسلام ایک پرائیویٹ مذہب بھی نہیں رہا، کیونکہ ان کی اپنی شخصی زندگی بجز اقرارِ اسلام اور ختنہ و نکاح کے اسلام کی پیروی کا کوئی اخلاقی یا عملی نشان اپنے اندر نہیں رکھتی۔ ان میں سے جن لوگوں میں مذہبیت کی طرف میلان باقی بھی رہا، یا پیدا بھی ہوا، تو زیادہ تر اس نے یہ شکل اختیار کی کہ مغرب اور اس کے فلسفوں اور نظریات اور عملیات کو معیارِ حق مان کر اسلام اور اس کے عقائد اور اس کے نظامِ زندگی اور اس کی تاریخ کی مرمت شروع کر دی گئی، اور کوشش کی گئی کہ اسلام کی ہر چیز کو اس معیار پر ڈھال لیا جائے، اور جو نہ ڈھل سکے اس کو ریکارڈ سے محو کر دیا جائے، اور جو محو بھی نہ ہو سکے اس کے لیے دنیا کے سامنے معذرتیں پیش کی جائیں۔

ان کی عظیم اکثریت نے مغرب کے فلسفۂ زندگی، اور مغربی تہذیب کی فلسفیانہ بنیادوں کو بھی بجنسہٖ اخذ کیا اور اس پر کسی تنقید کی ضرورت نہ محسوس کی۔ یہ لازمی نتیجہ تھا اس تعلیم کا جو انہیں ابتدائی مدارج سے لیکر آخری مراتب تک مدرسوں اور کالجوں میں دی گئی۔ تاریخ، فلسفہ، معاشیات، سیاسیات، قانون، اور دوسرے علوم کو جس طرز پر انہوں نے پڑھا اُس سے وہی ذہنیت بن سکتی تھی جو خود ان کے مغربی استادوں کی تھی، اور دنیا اور اس کی زندگی کے متعلق ان کا نقطۂ نظر وہی کچھ ہو سکتا تھا جو اہلِ مغرب کا تھا۔ خدا اور آخرت کا علانیہ انکار تو کم ہی لوگوں نے کیا، مگر ہمارے ہاں اس تعلیم سے متاثر ہونے والوں میں ایسے لوگ بھی آخر کتنے پائے جاتے ہیں جو مادہ پرستانہ ذہنیت اور فکرِ آخرت سے بے نیاز نظریۂ حیات نہیں رکھتے؟ جو اَن دیکھی غیر محسوس حقیقتوں کی بھی کچھ حقیقت سمجھتے ہیں؟ جن کی نگاہ میں مادّی قدروں سے بلند تر روحانی قدروں کی بھی کچھ وقعت ہے؟ اور جو دنیا کو اغراضِ نفسانی کی ایک بے دردانہ کشمکش کا میدانِ جنگ نہیں سمجھ رہے ہیں؟

اخلاق کے معاملہ میں اِس انفعالی ردِّعمل کا نتیجہ اس سے بھی بدتر ہوا۔ اپنے دورِ انحطاط

میں ہمارے اخلاق کی جڑیں بوسیدہ تو پہلے ہی ہو چکی تھیں۔ ہمارے امرا اور اہلِ دولت پہلے سے عیش کوش تھے ہمارے متوسط طبقے کرائے کے سپاہی اور بھاڑے کے ٹٹو پہلے ہی سے بنے ہوئے تھے۔ ہمارے اندر کوئی مستقل اور مخلصانہ وفاداری پہلے ہی موجود نہ تھی۔ پھر جب اس کے ساتھ مغرب کے فلسفۂ اخلاق کا جوڑ لگا تو یہاں وہ سیرتیں پیدا ہونی شروع ہو گئیں جو مغربی سیرت کے تمام بُرے پہلوؤں کی جامع اور اس کے اکثر روشن پہلوؤں سے خالی ہیں۔ افادیت اور لذت پرستی اور بے اصولی میں تو ہمارے ہاں کی مغرب زدہ سیرت اسی سطح پر ہے جس پر خود اہلِ مغرب کی سیرت پہنچی ہوئی ہے۔ مگر وہاں کوئی مقصد زندگی ہے جس کے لیے سخت کوشی و جانفشانی کی جاتی ہے، اور یہاں کسی مقصد زندگی کا پتہ نہیں۔ وہاں کوئی نہ کوئی ایسی وفاداری موجود ہے جس میں اخلاص پایا جاتا ہے جسے بیچا اور خریدا نہیں جا سکتا، مگر یہاں سب کچھ قابلِ فروخت ہے اور ہر شے کا تبادلہ روپے یا ذاتی مفاد سے کیا جا سکتا ہے۔ وہاں کچھ بد اخلاقیاں صرف غیر قوموں کے مقابلہ میں برتنے کے لیے مخصوص ہیں جن کا ارتکاب اپنی قوم کے خلاف کرنا گناہ عظیم سمجھا جاتا ہے، مگر یہاں جھوٹ، مکر، دھوکے، بد عہدی، خود غرضی، سازش اور تحریص و تخویف کے ہتھیار خود اپنی قوم کے خلاف استعمال کر ڈالنے میں بھی مضائقہ نہیں ہے۔ امریکہ یا انگلستان میں کوئی یہ اخلاق برتنے تو اس کا جینا مشکل ہو جائے، مگر یہاں بڑی بڑی جماعتیں ان اخلاقیات کے بل پر اٹھتی اور فروغ پاتی ہیں، اور جو لوگ ان اوصاف میں اپنی مہارت ثابت کر دیتے ہیں اُن کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ قیادتِ ملی کے لیے یہی موزوں ترین اشخاص ہیں۔

معاشرت او معیشت اور قانون کے بارے میں مغربی تسلط کے جن اثرات کا ابھی ابھی میں آپ سے ذکر کر چکا ہوں ان سب کو قبول کرنے والے اور انہیں لے کر اپنی قوم میں پھیلانے والے بھی وہی لوگ تھے اور ہیں جنہوں نے اس انفعالی ردعمل کی راہ اختیار کی۔ تاہم ان میں سے کوئی چیز بھی اس قدر حیرت انگیز نہیں ہے جس قدر انگریزوں کے قائم کیے ہوئے سیاسی نظام کے معاملے میں ان کا ردّعمل حیرت انگیز ہے۔ اس گروہ کو سب سے زیادہ ناز اپنی سیاسی سوجھ بوجھ پر ہے، مگر انہوں نے سب سے بڑھ کر اپنی نااہلی کا ثبوت اسی معاملے میں دیا ہے۔ جس سیکولرزم، نیشنلزم اور ڈیموکریسی پر ہندوستان کے سیاسی نظام

کی بنا رکھی گئی تھی اور جس پر انیسویں صدی کے نصف آخر سے مسلسل اس کا ارتقا ہو رہا تھا اس کو اگر ہندوؤں نے تسلیم کیا تو یہ ایک امرِ طبعی تھا، کیونکہ اس کا ہر جُز ان کے لیے مفید تھا۔ لیکن مسلمان، جن کے لیے اس کا ہر جُز تباہ کن تھا، اُن کا اس سیاسی نظام کے بنیادی اصولوں کو چیلنج نہ کرنا اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ ان کے نئے تعلیم یافتہ لوگوں نے سیاست پڑھی چاہے کتنی ہی ہو، اسے سمجھا کبھی نہیں۔ وہ مغرب سے اتنے مرعوب تھے کہ جو کچھ وہاں سے آتا اسے وحی آسمانی سمجھ کر قبول کر لیتے تھے اور کسی چیز کو تنقید کی کسوٹی پر کس کر دیکھنے کی انہیں ہمت نہ ہوتی تھی۔ اسی شکست خوردہ ذہنیت کے ساتھ انہوں نے سیاست پڑھی اور نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے تمام نظریات کو بھی آنکھیں بند کر کے مانتے چلے گئے۔ ان کے اندر نہ اتنی عقل تھی کہ اس سیاسی نظام کی بنیادوں کو جانچ کر دیکھتے اور نہ اتنی جرأت تھی کہ علمی حیثیت سے اُن بنیادوں کو چیلنج کر سکتے اور اپنے آقاؤں سے یہ کہہ سکتے کہ تمہارے یہ اصول اس ملک میں نہیں چل سکیں گے۔ انہوں نے آدھی جنگ تو اسی روز ہار دی تھی جبکہ سیکولرزم، نیشنلزم اور ڈیموکریسی کے ان اصولوں کو اصولِ برحق مان لیا۔ اس کے بعد نہ ان کی یہ پالیسی چل سکی کہ سیاسی ارتقاء کی رفتار اور اہلِ ملک کی طرف اختیارات کے انتقال کو روکا جائے، اور نہ یہی پالیسی کامیاب ہوئی کہ اس سراسر غلط سیاسی نظام میں مسلمانوں کو ایسے تحفظات حاصل ہو جائیں جو اس کے تباہ کن اثرات سے انہیں بچا سکیں۔ آخر کار جب وہ سیاسی نظام پختہ ہو کر اپنے تکمیلی مرحلے میں پہنچ گیا تو ہمیں چار و ناچار اس پر راضی ہونا پڑا کہ ہم میں سے آدھے قبر میں جائیں اور آدھے بچ نکلیں! اس پر بھی ہمارے سیاسی رہنماؤں کی سمجھ میں اب تک یہ نہیں آیا ہے کہ جس سیاسی نظام نے ہم کو قبر تک پہنچا دیا اس کی بنیادوں میں کیا نقائص ہیں۔ چنانچہ وہ آج بھی اُس نظام کو انہی بنیادوں کے ساتھ جوں کا توں باقی رکھے ہوئے ہیں اور اس کو بدلنے کی ضرورت کا کوئی احساس ان کے اندر نہیں پایا جاتا۔ اب ایک کندذہن آدمی کے سوا کون یہ باور کر سکتا ہے کہ سیاست کے مطالعے اور تجربے نے کوئی سیاسی بصیرت ان لوگوں میں پیدا کی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ انفعالی ردِّ عمل سراسر نقصان ہی نہ تھا۔ اس میں فائدے کے پہلو بھی کچھ تھے۔ اس سے ہمارا پچھلا جمود ٹوٹا۔ ہم موجودہ زمانے کی ترقیات سے آشنا ہوئے۔ ہمارے نقطۂ نظر میں

وسعت پیدا ہوئی۔ ہم اس شدید نقصان سے بچ گئے جو صرف غیر مسلموں کے جدید تعلیم پانے اور حکومت کے نظم ونسق میں دخیل ہو جانے سے پہنچ سکتے تھے۔ ہمارے بہت سے آدمیوں کو حکومت کے مختلف شعبوں کا تجربہ حاصل ہوا۔ ان فائدوں میں سے کسی کا بھی میں منکر نہیں ہوں۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی تو واقعہ ہے کہ اس کی بدولت ہمارا تصور دین بدلا، تصور اخلاق بدلا، فلسفۂ زندگی بدلا، ہماری قدریں متغیر ہوئیں، ہماری انفرادی سیرت اور اجتماعی تہذیب کی بنیادیں متزلزل ہو گئیں، اور ہم اسلاف کی اندھی تقلید سے نکل کر اغیار ــــ اور گمراہ و بدکردار اغیار ــــ کی اندھی تقلید میں مبتلا ہو کر رہ گئے جس نے ہمیں دینی حیثیت سے بھی تباہ کیا اور دنیوی حیثیت سے بھی۔

جمود کی ردعمل ہمارے ہاں ایک دوسرے گروہ کا ردعمل اس کے بالکل برعکس تھا۔ پہلا گروہ اگر آنے والے سیلاب میں بہ نکلا تو یہ دوسرا گروہ اس کے آگے جمود کی چٹان بن کر بیٹھ گیا۔ اس نے کوشش کی کہ علم اور مذہب اور اخلاق اور معاشرت اور روایات کی اس پوری میراث کو جو اٹھارویں صدی کے لوگوں نے چھوڑی اور انیسویں صدی کے لوگوں نے پائی تھی ــــ اس کے تمام صحیح و غلط اجزاء سمیت ــــ جوں کا توں باقی رکھا جائے، اور نئی فاتح تہذیب کا نہ کوئی اثر قبول کیا جائے، نہ اس کے سمجھنے ہی میں اپنا وقت ضائع کیا جائے۔ اس گروہ کے لوگوں نے آثارِ قدیمہ کے تحفظ کا جو رویہ مغربی تہذیب سے پہلا تصادم پیش آنے کی ساعت میں اختیار کیا تھا، اس پر وہ آج تک بلا کسی ترمیم و نظرِ ثانی کے قائم ہیں۔ انہوں نے اپنا ایک لمحہ بھی سنجیدگی کے ساتھ اس کام میں صرف نہ کیا کہ اگلوں کی میراث کا تجزیہ کر کے دیکھیں کہ اس میں کیا باقی رکھنے اور کیا بدلنے کے لائق ہے۔ نہ انہوں نے کبھی سنجیدگی کے ساتھ اسی سوال پر غور کیا کہ آنے والی تہذیب کیا کچھ لینے کے قابل اور کیا کچھ چھوڑ دینے کے قابل لائق ہے۔ اور نہ انہوں نے کبھی یہ سمجھنے کی کوئی معقول کوشش کی کہ ہمارے نظامِ فکر و عمل میں وہ کیا خامیاں تھیں جو ہماری شکست کی موجب ہوئیں اور ہزارہا میل کے فاصلہ سے آئی ہوئی ایک قوم کے پاس علم و عمل کی وہ کیا طاقت ہے جو اس کے غلبے کا سبب بن گئی۔ ان امور کی طرف توجہ کرنے کے بجائے انہوں نے اپنا سارا زور حالتِ سابقہ کو برقرار رکھنے پر صرف کیا اور آج تک کیے جا رہے ہیں۔ ان کا

نظامِ تعلیم اور نصابِ تعلیم وہی ہے جو انیسویں صدی کے آغاز میں تھا۔ ان کے مشاغل وہی ہیں ان کے مسائل وہی ہیں۔ ان کا اندازِ فکر وہی ہے۔ ان کا طریق کار وہی ہے۔ اور ان کے ماحول کی خصوصیات وہی ہیں۔ جو کچھ اُس میں اچھائیاں تھیں وہ بھی محفوظ ہیں۔ اور جو کچھ اُس میں خامیاں تھیں وہ بھی محفوظ ہیں۔

مَیں مانتا ہوں کہ اس ردِّ عمل کے اندر فائدے کا ایک قیمتی پہلو تھا اور ہے۔ وہ جتنا قابلِ قدر ہے اس کی اتنی ہی قدر میرے دل میں ہے۔ ہمارے ہاں جو کچھ بھی قرآن و حدیث اور فقہ کا علم بچارہ گیا ہے اسی کی بدولت بچا ہے۔ ہمارے بزرگوں نے دین و اخلاق کی جو میراث چھوڑی تھی، بسا غنیمت ہے کہ کچھ لوگ اس کو سنبھال کر بیٹھ گئے اور آئندہ نسلوں کی طرف اس کو منتقل کرتے رہے۔ ہماری تہذیب کی جو اہم خصوصیات تھیں، نہایت قیمتی خدمت ہے کہ کسی نے ان کی حفاظت کی کوشش کی اور سخت مخالف ماحول میں ان کو تھوڑا یا بہت برقرار رکھا۔

میں یہ بھی مانتا ہوں کہ جن لوگوں نے اس ردِّ عمل کی ابتدا کی وہ بڑی حد تک معذور تھے۔ جس وقت تہذیبِ مخالف کے سیلاب سے ان کو اچانک تصادم پیش آیا اُس وقت شاید وہ اِس سے زیادہ کچھ نہ کر سکتے تھے کہ اپنے گھر کی جتنی چیزیں بھی بچا سکتے ہیں بچالیں۔ اس معاملہ میں ان کی معذوری پہلے ردِّ عمل کے بانیوں کی معذوری سے کچھ کم درجے کی نہیں ہے۔ ہم پہلے گروہ کے ابتدائی لیڈروں کو بھی یہ الاؤنس دیتے ہیں کہ اجنبی اقتدار کے سیلاب سے پہلا تصادم پیش آنے پر وہ اس کے سوا کچھ نہ سوچ سکتے تھے کہ اپنی قوم کو کامل تباہی سے اور شودروں میں تبدیل ہو جانے سے بچانے کے لیے وہ راہ اختیار کریں جو انہوں نے کی۔ ایسے ہی الاؤنس کے مستحق دوسرے گروہ کے ابتدائی لیڈر بھی ہیں جنہوں نے آغازِ تصادم میں اپنے مذہب اور تہذیب کے باقیات کو مٹنے سے بچانے کی فکر کی۔ مگر قانونِ قدرت میں معذرتیں (Apologies) اور رخصتیں (Allowances) نہیں چلا کرتیں۔ کوئی کام خواہ کسی وجہ سے کیا گیا ہو، اس میں اگر نقصان کا کوئی سبب موجود ہو تو وہ نقصان پہنچ کر ہی رہتا ہے، اور واقعہ میں جو نقصان پہنچا ہو اُسے نقصان ماننا ہی پڑتا ہے۔

اس کا پہلا نقصان یہ تھا کہ حالتِ سابقہ کے تحفظ کی کوششوں۔ ۔ دین اور اس سے تعلق رکھنے

والی قابلِ قدر چیزوں کے ساتھ ساتھ اُن تمام کمزوریوں اور خرابیوں کا بھی پورا تحفظ کیا جو ہمارے دورِ انحطاط کے مذہبی تصورات اور مذہبی گروہوں میں موجود تھیں۔ یہ ملی جلی میراث جوں کی توں ہمارے حصہ میں آئی ہے اور اب یہ ایک صحیح اسلامی انقلاب کے راستہ میں ویسی ہی سخت رکاوٹ بن رہی ہے جیسی ہمارے مغربیت زدہ طبقوں کی ذہنیت بن رہی ہے۔

اس کا دوسرا نقصان یہ ہوا کہ ہمارے دین اور اخلاق اور تہذیب کے اصلی جوہر کی حفاظت جیسی ہونی چاہیے تھی، اس کے ذریعہ سے نہ ہو سکی، بلکہ وہ روز افزوں زوال میں مبتلا ہوتا چلا گیا۔ ظاہر ہے کہ سیلابوں کا مقابلہ سیلاب ہی کر سکتے ہیں، چٹانیں نہیں کر سکتیں۔ یہاں کوئی طاقت ایسی نہ تھی جو مغربی تہذیب کے مقابلہ میں اسلامی تہذیب کا کوئی سیلاب اٹھا سکتی۔ یہاں صرف "قدیم کی محافظت" پر اکتفا کیا گیا، اور اس "قدیم" میں اصل قابلِ حفاظت چیزوں کے ساتھ بہت سی ایسی چیزیں بھی شامل رکھی گئیں جو نہ زندگی کی طاقت رکھتی تھیں، نہ اس لائق تھیں کہ ان کی حفاظت کی جاتی اور نہ ان کے شمول سے یہ امید ہی کی جا سکتی تھی کہ ایک مخالف تہذیب کے مقابلہ میں اس سے اسلام کی عزت قائم رہ سکے گی۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلے ساٹھ ستر سال کی تاریخ پر جب ہم نگاہ ڈالتے ہیں تو اس دوران میں ہم کو اسلام اور اس کی تہذیب آگے بڑھتی ہوئی نہیں بلکہ مسلسل پسپا ہوتی نظر آتی ہے۔ ہر سال اور ہر مہینے اور ہر دن کے حساب سے وہ دبتی اور سکڑتی رہی ہے اور مغربی تہذیب بڑھتی اور پھیلتی چلی گئی ہے۔ ہر دن جو ہم پر طلوع ہوا، اس طرح طلوع ہوا کہ مغرب کی ذہنی گمراہیوں اور اخلاقی گندگیوں اور عملی بدراہیوں نے ہماری زندگی کے کچھ مزید رقبے پر قبضہ کر لیا اور ہمارے دین اور اخلاق اور تہذیب نے کچھ مزید رقبہ کھو دیا۔ اس رفتار کو ہمارے محافظینِ طرزِ قدیم ایک لمحہ کے لیے بھی نہ روک سکے۔

اس کا تیسرا نقصان یہ ہوا کہ ہمارا مذہبی گروہ اسلام اور غیر اسلامی قدامت کے جس مرکب کی حفاظت کر رہا تھا اس کے اندر فکری اور عملی، دونوں حیثیتوں سے ہمارے اہلِ دولت اور اہلِ دماغ طبقوں کے لیے بہت کم کشش باقی رہ گئی، بلکہ اس کی کشش روز بروز کم ہوتی چلی گئی۔ ایک

طرف مخالف تہذیب دماغوں کو مسخر کرنے والے، دلوں کو موہ لینے والے اور نگاہوں کو خیرہ کر دینے والے ساز و سامان کے ساتھ بڑھی چلی آ رہی تھی۔ دوسری طرف اسلام کی نمائندگی ایسے مباحث، مسائل، مشاغل اور مظاہر کے ذریعہ سے کی جا رہی تھی جو نہ دماغوں کو مطمئن کرتے تھے، نہ دلوں کو اپیل کرتے تھے، نہ نگاہوں کو بھلے لگتے تھے۔ اس وجہ سے مادّی وسائل اور دماغی صلاحیتیں رکھنے والے گروہ دین سے اپنی رہی سہی دلچسپی بھی کھوتے اور مغربی تہذیب میں جذب ہوتے چلے گئے، اور مذہبیت کی میراث سنبھالنے کا کام بتدریج ہمارے اُن طبقوں کے لیے مخصوص ہوتا چلا گیا جو مادّی، ذہنی اور معاشرتی حیثیت سے پست تر تھے۔ اس کا نقصان صرف اتنا ہی نہ ہوا کہ مذہبیت کا محاذ کمزور سے کمزور تر اور مغربیت کا محاذ قوی سے قوی تر ہوتا رہا، بلکہ اس سے کچھ بڑھ کر یہ نقصان ہوا کہ اسلام کی نمائندگی کا معیار، علم و عقل اور زبان و اخلاق، ہر اعتبار سے گرتا ہی چلا گیا یہاں تک کہ دین اور دینداری کی آبرو بچنی مشکل ہو گئی۔

آخری اور سب سے بڑا نقصان اس پالیسی کا یہ ہوا کہ مسلمانوں کی قیادت و رہنمائی سے اہلِ دین بے دخل ہو گئے اور تعلیم، تمدن، معیشت اور سیاست، ہر معاملے میں مسلمانوں کو راستہ دکھانا اور اپنے پیچھے لے کر چلنا اُن لوگوں کا کام ہو گیا جو نہ دین کو جانتے ہی ہیں اور نہ کوئی قدم دین سے پوچھ کر اٹھانے کی ضرورت ہی محسوس کرتے ہیں۔ انہوں نے ساری تعلیم مغربی طرز پر پائی ہے۔ ان کی زندگیاں مغربی نظامِ معیشت سے بنی ہیں۔ ان کی معاشرت مغربی سانچوں میں ڈھلی ہے۔ ان کے اخلاق مغربی قدروں اور اصولوں پر تعمیر ہوئے ہیں۔ انہوں نے تربیت مغرب کے لاکالجوں سے لی اور اسی کی پریکٹس کی ہے۔ اور انہوں نے سیاست کے سارے اصول اور رنگ ڈھنگ اور جوڑ توڑ مغرب سے سیکھے ہیں۔ اس سرچشمۂ ضلالت سے جو رہنمائی انہوں نے پائی اسی پر وہ چلے اور ساری قوم کو اس پر چلایا اور قوم پورے اعتماد سے ان کے پیچھے چلی۔ اہلِ دین کا اس سارے کاروبار میں اگر کوئی کام رہا تو یہ کہ یا تو گوشہ نشین ہو کر درس و تدریس اور ذکر و تسبیح میں مشغول رہیں، یا قومی قیادت پر جو بھی فائز ہو اس کے دعاگو بن کر رہیں، یا پھر سیاست کے میدان میں آئیں تو کسی